ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڈھ کا پندرہ روزہ اخبار

قیمت فی پرچہ دو روپے | سالانہ چندہ ۲ روپے

جلد ۱۲ | یکم جون ۱۹۵۳ء — ایڈیٹر قاضی عبدالغفار — ۱۸ رمضان المبارک ۱۳۷۲ھ | نمبر ۱۱

نیک خواہشیں اور اچھے اصول

مگر ....؟

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے زبان کے مسئلہ پر ایک تازہ رزولیوشن کی صورت میں اپنے اصولوں کی وضاحت کی ہے رزولیوشن کی عبارت حسب ذیل ہے:-

"کانگریس کی سوچی سمجھی ہوئی پالیسی جسکو ہندستان کے دستور میں بھی شامل کیا گیا ہے، یہ ہے کہ:-

۱- ملک کی قومی زبان کی حیثیت سے ہندی زبان کو ترقی دی جائے۔

۲- اور اسی کے ساتھ صوبوں کی بڑی زبانوں کو بھی ہر ایک کے اپنے علاقے میں عام طور پر ترقی دی جائے اور علاقائی زبان ہی عام طور پر اپنے اپنے علاقے میں کاروبار کی زبان ہو۔

۳- تعلیم کی حد تک ابتدائی مدارس میں ذریعہ تعلیم طلبا کی مادری زبان ہو اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جائے کہ اس غرض سے ہر جگہ جہاں ایسے طلبا کی کافی تعداد ہو جن کی مادری زبان کوئی خاص زبان ہو اور وہ ایسی خواہش کرے تو اس کے لئے مادری زبان کی تعلیم کی کافی آسانیاں بہم پہونچائی جائیں۔ اس طرح کسی ایسے رقبے میں جہاں کوئی خاص زبان بنیادی زبان ہو جہاں تک ممکن ہو اس قسم کا مادری زبان میں تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے بشرطیکہ ایسے طلبا کی کافی تعداد موجود ہو۔

....

دستور کی آٹھویں فہرست میں ہندوستان کی خاص زبانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان زبانوں میں ایک اردو زبان بھی ہے۔ ورکنگ کمیٹی یقین کرتی ہے کہ اس کو اس کا صحیح مقام دیا جائے گا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اردو ہندوستان ہی کی ایک زبان ہے جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی اور یہیں اس نے ترقی کی اور یہ کہ ہندستان کی آبادی کی ایک بڑی تعداد اس کو بولتی اور لکھتی ہے۔"

اس قرارداد میں کوئی ایسی خاص اور نئی حقیقت پیش نہیں کی گئی جو اب تک اردو زبان کے کسی مخالف یا موافق سے پوشیدہ رہی ہو اور نہ اس قرارداد میں کوئی ایسی قوت معلوم ہوتی ہے جس سے ہماری جد و جہد کی قوت میں کوئی اضافہ ہوتا ہو۔

۱۹۴۷ء کے بعد سے اس کانگریس کے جسم سے جو ہم جانتے تھے مہاتما گاندھی کی تعلیمات کی روح نکل چکی ہے اور اب اقتدار

حاصل ہو جانے کے بعد وہ روح سمٹ سمٹا کر جواہر لال نہرو اور اوران کے چند مخلص ساتھیوں اور دوستوں کے حلقے میں محدود ہوگئی ہے کانگریس کے وسیع تر حلقہ میں کوئی ایسی پرچھائیں نظر نہیں آتی۔ اس لئے جب کانگریس کے اعلیٰ حلقوں میں حق وانصاف کی کوئی آواز اٹھتی ہے تو ہم اُس کو قدرتاً صرف جواہر لال اور ان کے محدود حلقے سے منسوب کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں سے یہ آواز اٹھی ہے بس وہیں رہ جائے گی! ہمارا یہ نقطۂ نظر کچھ غلط بھی نہیں ... جب تجربہ ہم کو بتاتا ہے کہ جواہر لال نہرو اور چند حقیقت شناس کانگریسی لیڈروں کی سیکڑوں تقریروں اور بیانوں کے بعد بھی جو وہ اردو زبان کی حمایت میں دیتے رہتے ہیں۔ خود ہمارے صوبہ کی کانگریس کمیٹی ہندوستان کے دستور اور "ہائی کمانڈ" کی ہدایتوں کے خلاف قراردادیں منظور کرتی ہے اور "ہائی کمانڈ" ایسی باغیوں کی بغاوت کو خاموشی سے پی جاتی ہے۔

ان احساسات کے تحت ورکنگ کمیٹی کی اس قرارداد کو پڑھ کر خوشی سے اچھل پڑنے کی کوئی معقول وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

قرارداد میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ "علاقائی زبان ہی اپنے علاقے میں کاروبار کی زبان ہو" اگر ورکنگ کمیٹی کے اس اصول سے اتر پردیش میں اردو زبان کا مستقبل بھی وابستہ کیا جائے تو یہ روشنی ایک چھوٹی سی کرن ہے جو اس رزولیوشن کے ایک گوشہ میں نظر آتی ہے۔ اور اس حقیقت کا تسلیم کیا جانا ہی کہ اردو زبان کو "ہندوستان کی آبادی کی ایک بڑی تعداد بولتی اور لکھتی ہے" اتر پردیش میں ہماری علاقائی تحریک کے لئے کسی قدر تقویت کا باعث ہوسکتا ہے۔ لیکن اس خواب کی دنیا میں ہم قدم رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب ہمارے صوبہ میں اس علاقائی زبان کے عام کاروبار میں استعمال ہونے کی اجازت ملے گی! بنگال میں بنگالی یا بمبئی میں گجراتی یا مدھیہ پردیش میں مرہٹی کو تو اس... اصول سے یقیناً تقویت حاصل ہوگی اور ان صوبوں کی حکومتیں شاید ہائی کمانڈ کی آواز کو سن لیں۔ لیکن ہمارے صوبہ کا ہائی کمانڈ، ہائی کمانڈ سے بھی زیادہ بلند مقام ہے۔ وہاں ایسی قراردادیں ردّی کی ٹوکری میں چلی جاتی ہیں!! یہاں تو اردو زبان کو خواہ مخواہ ہندی کا رقیب قرار دیکر یہ باطل عقیدہ کارفرما ہو رہا ہے کہ جب تک اردو اس سرزمین پر باقی ہے ہندی کی ترقی کا میدان تنگ رہے گا۔ لہذا ہندی کے فروغ کی پہلی شرط اردو کا زوال ہے!! اس تنگ نظری اور تنگ ظرفی کی اصلاح ورکنگ کمیٹی کی قراردادیں نہیں کرسکتیں!

اگر صرف اتنا ہی ہو جائے کہ ورکنگ کمیٹی کی اس قرارداد سے اردو دوست حلقوں میں اُون سہمے ہوئے اور ڈرے ہوئے ضمیروں کو جن کا دین وایمان نیتاؤں کی خوشامد ہے کلمۂ حق کہنے کی کچھ ہمت حاصل ہو جائے تو ہم سمجھیں گے کہ ورکنگ کمیٹی کی قرارداد بیکار نہیں گئی۔ ورنہ خود اپنے ایسے دوستوں کا ماتم ہمارے لئے کافی ہے جو گھر بیٹھ کر تو اردو کے غم میں گھلے جاتے ہیں لیکن باہر نکل کر، کسی نیتا، کسی وزیر، کسی اقتدار پسند کانگریسی کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ ہم تو یہ تماشے روز دیکھتے ہیں۔ اور اسی لئے اردو کے دوستوں سے بار بار کہتے رہتے ہیں کہ وہ کانگریس کمیٹیوں یا اتر پردیش کی حکومت کی مہربانیوں کا انتظار کرنے کے بجائے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ اردو کی حفاظت اور ترقی کانگریس یا کسی سیاسی جماعت کی امداد پر منحصر نہیں ہے بلکہ منحصر ہے خود اردو والوں کی جدوجہد اور قربانیوں پر۔

یوں تو بہر حال ہمیں ورکنگ کمیٹی کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ اُس نے ان حقیقتوں کو بالکل صاف کردیا جن کے لئے ہم نے علاقائی تحریک کا محاذ قائم کیا ہے۔ لیکن یہ رسمی شکر گذاری کچھ ایسی ہی ہے جیسے کسی شاعر کا ایک مصرعہ کسی قدر تصرف کے بعد:-

وہ یہ کہتے ہیں کہ کیا خوب زبان ہے اردو
میں یہ کہتا ہوں کہ "آداب بجا لاتا ہوں"!

دو ادیبوں کی وفات

اردو کی محفل ادب کے دو اور چراغ گل ہو گئے۔ گذشتہ دور کے ممتاز ادیبوں میں سلطان حیدر جوش کا نام مشہور تھا سرکاری ملازمت کی پابندیوں کے باوجود اُن کی خداداد ذہانت اور ان کا ادبی ذوق بے عمل نہیں رہا۔ اور مرحوم ہمارے ادب میں دلچسپ اور مفید اضافے کرتے رہے۔ مرحوم اُس ادبی دور کی یادگار تھے جو سرشار، سرشار اور سجاد حسین کے بعد شروع ہوا تھا۔ وہ علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور ملازمت سے وظیفہ یاب ہو کر علی گڈھ ہی کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ علی گڈھ کے طلبائے قدیم اور ملک کے ادبی حلقوں میں ان کی وفات کی خبر بہت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی۔

اسی طرح اجمیر کے مولانا معنی اجمیری کی وفات سے بھی ہماری محفل ادب میں ایک جگہ خالی ہو گئی ہے۔ جس کا پُر کرنا مشکل ہے۔ مولانا مرحوم اجمیر کے ایک ممتاز، شاعر، ادیب اور اہل قلم تھے اور شخصی خوبیوں اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ انھوں نے ہمیشہ ایک درویشانہ زندگی گزاری اور اپنے خداداد ادبی ذوق سے اردو زبان کی گرانقدر خدمت انجام دی۔ اجمیر کے ادبی اور علمی حلقوں میں مولانا مرحوم کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔

ہلکے ہلکے اشارے

—— "لکھنؤ، ۱۷ مئی۔ اردو کسی فرقے یا طبقے کا ترکہ نہیں ہے بلکہ تمام ملک کا ترکہ ہے جسے ہندو مسلمانوں نے مل کر پروان چڑھایا اور سنوارا ہے"۔

یہ فرمایا ڈاکٹر بینی لال کمار صاحب نے جو اردو شاعر گرد نرائن لطف جائسی کے یادگار جلسہ کی صدارت فرما رہے تھے انھوں نے فرمایا کہ:۔

"اردو زبان کو آج بھی عوامی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے باقی رہنا چاہئے"۔

—— اور سچ یہ ہے کہ یہ سب باتیں غلط فرمائیں۔ اس لئے کہ اتر پردیش میں فرمائیں!!

—— لکھنؤ ۱۷ مئی۔ "اردو زبان خالص عوامی ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت عالم وجود میں آئی تھی۔ دکن، دہلی اور ہندستان کے مختلف خطے اس کا گہوارہ بنے۔ لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ اردو کو سنوارنے میں لکھنؤ نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ وہ زبان کی تاریخ میں ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد کی جائیں گی"۔

یہ وہ خیالات ہیں جو وزیر انصاف و آبکاری سید علی ظہیر نے یہاں "یوم آتش" کا افتتاح کرتے ہوئے سنیچر کی رات کو ظاہر کئے۔

"انجمن فردوس ادب نے مشاہیر شعرو ادبا اردو اساتذۂ فن کی یادگار منانے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ ایک قابل قدر اور بیش قیمت کارنامہ ہے اور ایسے دور میں جب کہ اردو زبان ایک بڑے امتحان سے گزر رہی ہے۔ ایسی تقریبات کا شروع کرنا اور بھی قابل قدر ہے"

—— اتر پردیش کے وزیر قانون کو ان ارشادات سے پہلے کچھ سوچنا چاہئے تھا۔ آخری بات جو اردو کے ایک بڑے امتحان سے گذرنے کی بات موصوف نے فرمائی وہ بہت بلیغ ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ اس امتحان میں اردو زبان کو ڈالنے والوں سے جناب وزیر صاحب موصوف کا قریبی تعلق ہے!

—— پاکستان کے نئے وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے اعلان کیا ہے۔ کہ ذاتی طور پر وہ اس بات کے حق میں ہیں کہ جس طرح کینیڈا میں انگریزی اور فرانسیسی دونوں سرکاری زبانیں ہیں۔ اسی طرح بنگالی اور اردو پاکستان کی دو قومی زبانیں قرار دی جائیں۔ بنگالی... اخباروں نے اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ مغربی پاکستان کے اخبار خاموش ہیں مگر انجمن ترقی اردو کے صدر ڈاکٹر عبد الحق نے بنگالی کو دوسری قومی زبان

بنانے کی تجویز کی مخالفت کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بنگال کو قومی زبان قرار دینا مسلم لیگ اور قائد اعظم کے اعلانوں سے انحراف کرنا ہے
—— " انحراف " ایک اصول سیاست ہے۔ ہندستان نے مہاتما گاندھی کے اعلانوں سے انحراف کیا تو پاکستان قائد اعظم کے وعدوں سے کیوں انحراف نہ کرے! —— جو لوگ ارباب سیاست کے کاروبار سے ہم آہنگ نہ ہو سکتے ہوں وہ زبان کے مسئلہ میں دخل ہی کیوں دیں!

مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ اتر پردیش میں ہندی اور اردو دو سرکاری زبانیں تسلیم کی جائیں یا ایک " ہندستانی " کو دونوں رسم الخط میں تسلیم کر لیا جائے تو کچھ تعجب نہیں اگر سرکار سے بغاوت اور دستور سے غداری کے جرم میں ہمارا چالان ہو جائے!!

مراسلات

بانس پار بھوروا کا سالانہ اجتماع

سالانہ جلسہ اور مشاعرہ عید کے تیسرے دن ہوگا۔ اس موقع پر علمی نمائش بھی کی جائے گی جس میں مشاہیر کے خطوط، نایاب قلمی کتابیں اور اس قسم کی دوسری چیزیں بھی پیش کی جائیں گی۔ نمائش کے افتتاح کے لئے مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی ایڈیٹر " معارف " دار المصنفین اعظم گڑھ سے درخواست کی گئی ہے۔ جلسے کی صدارت محمد نسیم ادیب بی۔ اے کریں گے۔ جلسے میں اہم تجویزوں پر تقریریں ہوں گی اور باہر سے آئے ہوئے نمائندے مقامی حالات پر اظہار خیال کریں گے۔ رات میں مشاعرہ ہوگا۔ جس کے افتتاح کے لئے حافظ شفیق صاحب جونپوری کو زحمت دی گئی ہے اور صدارت کے لئے جناب شفیق صاحب الہ آبادی سے استدعا کی جا رہی ہے۔

(نعیم الحق بھوروی۔ کنوینر)

صدر مجلس استقبالیہ:۔ مسعود عالم صاحب اور سیکریٹری احمد علی صاحب منتخب کئے گئے۔

مدھیہ پردیش میں ابتدائی تعلیم کا مسئلہ

ایم پی حکومت نے پچھلے بجٹ سیشن میں یہ اعلان کیا تھا کہ وہ پرائمری تعلیم کو وسعت دینا چاہتی ہے اور ایک سال کے عرصے میں مزید ایک ہزار اسکولوں کے کھولنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس اعلان کا ہر مکتب خیال کے لوگوں نے خیر مقدم کیا۔

اس اعلان کے ہوتے ہوئے جب ہم یہ خبر سنتے ہیں کہ فلاں مقام کے اتنے اتنے بچوں کو پرائمری اسکولوں میں داخلہ نہیں ملا تو تعجب ہوتا ہے۔ یہ داخلہ اگر جگہ کی قلت کی بنا پر رکے تو ایک بات بھی ہے۔ لیکن جب مالی حالت کی بنا پر کوئی لوکل باڈی ایسا کرتی ہے یا کرنے پر مجبور ہوتی ہے تو حکومت کا کام یہ ہے کہ وہ اس کی مدد کو پہنچے۔ پرائمری تعلیم کی وسعت کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ کسی علاقہ میں جہاں وہ خود بخود بڑھ رہی ہو رکاوٹ نہ ہو اور دوسرے نئے علاقوں میں پھیلے۔ دراصل پرائمری تعلیم کے بارے میں کسی متعین پالیسی کے نہ ہونے سے ایسا ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس صورت حال پر فوراً غور کر کے اس کو دور کیا جائے۔

میں نے اوپر جو کچھ کہا ہے اس کو سمجھانے کے لئے میں کامٹی کی مثال پیش کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مرہٹی کے تقریباً ۶۵ ہندی کے تقریباً ۳۲ اور اردو کے تقریباً سوا سو طلباء کو داخلہ نہیں ملا ہے۔ اسی طرح گرلز اسکول میں بھی تقریباً ۴۰ لڑکیوں کو داخلہ نہیں دیا گیا۔ اگر ان بچوں کو داخلہ نہ دے کر کہیں نئی جگہ اسکول شروع کیا جائے تو اس کو وسعت دینا نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ حکومت لوگوں کو بیوقوف بنا رہی ہے۔ حکومت کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ایک دفعہ تو کسی کو بے وقوف بنا سکتی ہے مگر ہمیشہ نہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ حکومت اس سلسلے میں اپنی پالیسی کا اعلان کرے گی۔

عبد الستار فاروقی
ایڈیٹر " الفاروق " کامٹی

کیا ملکی وحدت کیلئے

زبان کی وحدت بھی ضروری ہے؟

(بسلسلہ اشاعت گذشتہ)

پاکستان کی وحدت و سالمیت سے مراد سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ پاکستان کے باشندوں میں اتحاد، محبت اور بھائی چارہ ہو۔ وہ پاکستان کو خوشحال، ترقی یافتہ، طاقتور اور مضبوط ریاست بنانے میں حصہ لیں۔ وہ پاکستان کی حفاظت کا مطلب اپنے گھر بار، جان و مال اور بیوی بچوں کی حفاظت سمجھیں۔ اور ایسا کوئی قدم نہ اٹھائیں جس سے پاکستان اور پاکستانی عوام کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس قسم کے حالات اسی صورت میں پیدا ہو سکتے ہیں جب عوام کو روٹی، روزگار، زمین اور شہری آزادی میسر ہو اور انہیں پھلنے، پھولنے اور ترقی کرنے کی تمام سہولتیں حاصل ہوں۔

پاکستان کی وحدت و سالمیت جذباتی بات نہیں وہ معاشی اور سیاسی مسئلہ ہے۔ زبان سے اس قسم کے مسئلے کا کوئی واسطہ نہیں۔ اگر کسی ریاست کے تمام باشندوں کی زبان ایک ہو تب بھی اس کی وحدت و سالمیت کو وہی خطرے پیش آسکتے ہیں جو ایک ایسی ریاست کو پیش آسکتے ہیں جہاں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں جہاں آبادی پچاس لاکھ سے بھی کم ہے، تین قومیں رہتی ہیں اور ان تین قوموں کی مادری زبانیں اس ملک کی قومی اور سرکاری زبانیں ہیں۔ تین سرکاری زبانیں ہونے کے باوجود یہ چھوٹی سی ریاست صدیوں سے موجود ہے۔ اُس کی وحدت و سالمیت بدستور باقی ہے۔ نہ اُس کا شیرازہ بکھرا ہے اور نہ اُس کے استحکام اور اتحاد میں کوئی فرق آیا ہے۔ اسی طرح سوویت یونین چھوٹی بڑی تقریباً ڈیڑھ سو قوموں اور قومیتوں کا گھر ہے۔ ہر قوم اور قومیت کا اپنا خطہ، اپنی حکومت، اپنی تہذیب اور اپنی زبان ہے۔ نازی فوجوں کے زبردست حملے کے باوجود سوویٹ یونین کی سالمیت قائم رہی۔ اُس کا شیرازہ نہیں بکھرا۔

برعکس اس کے فرانس میں ایک ہی زبان رائج ہے، مگر جب ہٹلر کی فوجوں نے حملہ کیا تو فرانس کی عظیم ریاست کا شیرازہ اٹھارہ دن کے اندر بکھر گیا۔ اور ایسا بکھرا کہ اب تک نہیں سدھرا۔

جب ۱۹۵۲ء کے شروع کے مہینوں میں اردو اور بنگالی کے سوال پر سارے ملک میں بحث چھڑی ہوئی تھی، مظاہرے ہو رہے تھے، گرفتاریاں ہو رہی تھیں، اور مقالے لکھے جا رہے تھے تو مشرقی بنگال کے تیرہ ایڈیٹروں نے جن میں مسٹر جسیم الدین بھی شامل ہیں، اخبارات کو ایک بیان دیا جس میں کہا تھا کہ "پاکستان کی وحدت و سالمیت پر دراصل وہ لوگ ضرب لگا رہے ہیں جو بنگالی زبان کی مخالفت کر رہے ہیں اور اردو کو زبردستی بنگالیوں کی زبان بنانا چاہتے ہیں۔" یہ بیان بہت حد تک درست ہے تاریخ اس کی تائید کرتی ہے۔ عربوں نے بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں غیر عربوں سے ان کی قومی زبان چھین لی اور ڈنڈے کے زور سے انہیں عربی بولنے اور لکھنے پر مجبور کیا۔ اس سے تمام محکوم قوموں بالخصوص ایرانیوں کے قومی جذبے نے انتقامی شکل اختیار کی۔ اور پھر ایرانیوں کے ہاتھوں پہلے خلافت بنو امیہ اور پھر خلافت بنو عباس پر جو گذری اور عربوں کی مضبوط مرکزی سلطنتوں کی وحدت و سالمیت کا جس طرح شیرازہ بکھرا اس سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔

پاکستان کو وجود میں آئے ساڑھے پانچ سال بیت چکے ہیں، مگر انگریزی بدستور ہمارے ملک کی سرکاری زبان ہے، اور کسی نے اب تک یہ نہیں کہا کہ اس بدیشی زبان کے بدستور سرکاری زبان رہنے سے پاکستان کے اتحاد، استحکام اور اس کی وحدت و سالمیت کو خطرہ ہے۔ ملک کے کسی گوشے سے یہ آواز نہیں اٹھی اور کسی نے یہ فتویٰ صادر نہیں کیا کہ انگریزی زبان کو پاکستان میں بدستور سرکاری زبان رکھنا شرک یا کفر ہے لیکن اب جو ملک کے ۵۶ فیصدی لوگوں نے اپنی مادری زبان بنگالی کو اردو کے پہلو میں کھڑا کرنے کا مطالبہ کیا ہے تو شرک اور کفر کا فتویٰ صادر کرنے والے میدان میں نکل آئے۔

ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ اگر ملک کی ایک صوبائی زبان بنگالی کو اردو کے پہلو بہ پہلو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے

تو دوسری صوبائی زبانوں کو اس حق سے کیسے محروم کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے صوبے بھی یہی مطالبہ کریں گے اور ان کے مطالبے کو تسلیم کر کے صوبائی زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ دینے سے پاکستان "برج بابل" ہو جائے گا۔ ایک طرف بنگلستان ہوگا۔ دوسری طرف پشتونستان تیسری طرف سندھستان اور چوتھی طرف پنجابستان۔ پاکستان کہیں بھی نہیں رہے گا۔

مگر حقیقت سے انکار کرنا دانشمندی نہیں، اس سے الجھے ہوئے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں واقعی ایک طرف بنگلستان، دوسری طرف سندھستان تیسری طرف پشتونستان اور چوتھی طرف پنجابستان ہے ایک اور سمت بھی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ وہ بلوچستان ہے۔ جہاں بلوچی زبان بولی جاتی ہے۔ پاکستان عبارت ہے انہیں "استانوں" کے اتحاد و اتفاق سے۔ پاکستان قائم ہے انہی "استانوں" کے بل بوتے پر اور انہی "استانوں" کی بنیاد پر۔

گذشتہ چھ ہزار برس سے ہر دور، ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ نے بار بار یہی سبق دیا ہے کہ ڈنڈے کی قوت اور بل بوتے پر قوموں اور "ستانوں" کا اتحاد و اتفاق اور ریاستوں کی وحدت و سالمیت کبھی قائم نہیں رہتی۔ بحر اوقیانوس کے مشرقی ساحل سے چین کی مغربی سرحدوں تک پھیلی ہوئی بنی اُمیہ کی مضبوط مرکزی سلطنت کا شیرازہ جب بکھرا تو ایک سال کے قلیل عرصہ میں اُس کا نام و نشان تک نہ رہا۔ قوموں اور "ستانوں" کا اتحاد و اتفاق اور ریاستوں کی وحدت و سالمیت وہی پختہ اور پائیدار ہوتی ہے۔ جس کی بنیادیں رضاکارانہ اتحاد پر ہوں جس کی بنیادیں ایک دوسرے کے حقوق کو ماننے اور اُس کا احترام کرنے کے اصولوں پر ہوں اور جس کی بنیادیں ایک دوسرے کو ترقی کرنے میں امداد دینے پر ہوں۔ پاکستان کی وحدت و سالمیت کو زندہ و جاوید رکھنے اور اُس میں بسنے والی قوموں میں اتحاد و اتفاق کی زنجیروں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کے لئے ضروری ہے کہ صوبوں کو اپنے اپنے حالات، قدرتی وسائل اور ضرورت کے مطابق زراعتی، صنعتی، تعلیمی، تہذیبی اور تجارتی ترقی کے لئے قدم اٹھانے کی خود مختاری حاصل ہو۔ زیادہ سے زیادہ جمہوریت ہو اور زیادہ سے زیادہ شہری آزادی ہو۔ اور کوئی شخص یہ محسوس نہ کرے کہ اُسے دبایا جا رہا ہے یا اُسے جائز حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے۔

پاکستان کی تمام قومی زبانوں کو —— سندھی پنجابی، بنگالی، بلوچی اور پشتو کو —— اُردو کے پہلو بہ پہلو پاکستان کی سرکاری زبانیں تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں آخر صوبہ سرحد میں تمام سرکاری اور دفتری کاروبار اور ذریعۂ تعلیم پشتو کیوں نہ ہو جو پٹھانوں کی مادری زبان ہے۔ سندھ میں سندھی کیوں نہ ہو۔ بلوچستان میں بلوچی کیوں نہ ہو۔ بنگال میں بنگالی اور پنجاب میں پنجابی کیوں نہ ہو۔ ہم خوشی خوشی انگریزی فرانسیسی، اطالوی اور دوسری زبانیں سیکھتے ہیں مگر بنگالی پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی کا نام سنتے ہی کیوں ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔ کیوں ان زبانوں کا ذکر آتے ہی انجمن ترقی اردو والے برہم ہو جاتے ہیں اور حقارت سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

زندگی کے تمام شعبوں میں ہمارے عوام کے پسماندہ رہنے کا بہت بڑا سبب یہ ہے کہ انہیں اُس زبان میں لکھنے پڑھنے، سوچنے اور کام کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے جو اُن کی مادری زبان نہیں ہے۔ نتیجہ اُس کا یہ ہے کہ علم و فضل صدیوں سے اونچے طبقوں کی اجارہ داری ہے اور عوام ہمیشہ سے بے خبر اور جاہل ہیں۔

قومی زبانوں کو علم و ادب سے محروم رکھنا اور ذریعۂ تعلیم اور دفتری کاروبار نہ بننے دینا عوام کو جاہل اور بے خبر رکھنے کا بہت پرانا طریقہ ہے۔ سوال اُردو دوستی یا اردو دشمنی کا نہیں ہے۔ سوال عوام کی تخلیقی قوتوں اور خوابیدہ احساسات کو بیدار کرنے کا ہے۔ سوال عوام کو علم و فضل کی دولت سے مالا مال کرنے کا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کی حقیقتوں کو سمجھ سکیں، اپنے مصائب کے اسباب کی بنیادوں سے واقف ہو سکیں، دنیا کے سیاسی اقتصادی اور سماجی ارتقاء اور ملکی تقاضوں کو سمجھ سکیں، اور اپنی تخلیقی قوتوں، ملک کی خوشحالی ترقی اور استحکام

راہ پر صرف کر سکیں۔ چنانچہ سوال عوام دوستی اور حب الوطنی کے تقاضوں کا ہے۔

عوام کو علم و فضل کی دولت سے مالا مال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انگریزی زبانوں کو ذریعہ تعلیم اور سرکاری زبان کی حیثیت سے ختم کیا جائے۔ صوبوں میں ذریعہ تعلیم اور دفتری کام عوام کی مادری زبانیں ہوں۔ پنجاب میں پنجابی، سندھ میں سندھی، بنگال میں بنگالی، سرحد میں پشتو اور بلوچستان میں بلوچی زبان ذریعہ تعلیم اور سرکاری کاروبار ہو۔ صوبائی حکومتیں اپنے اپنے صوبے کی قومی زبانوں کو ترقی دیں۔

اُردو پاکستان میں آباد قوموں کے باہمی میل ملاپ اور گفت و شنید کا ذریعہ ہے۔ اور یوپی، بہار، انبالہ ڈویژن اور راجپوتانہ سے آنے والے مہاجرین کی مادری زبان ہے۔ اُسے ثانوی زبان کی حیثیت سے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھایا جائے اور اُسے ترقی دی جائے۔ مہاجروں کی سہولیت کے لئے انہیں تعلیم اردو میں دی جائے۔

صوبائی حکومتیں اپنا سارا دفتری کام اپنے اپنے صوبے کی قومی زبان میں کریں۔ صوبوں کے سرکاری اور نیم سرکاری محکموں میں ملازمتیں اُن لوگوں کو دی جائیں جو متعلقہ صوبے کی قومی اور سرکاری زبان میں لکھ پڑھ اور گفتگو کر سکتا ہے۔ سرکاری ملازموں کو صوبائی زبانیں سکھانے کے لئے خاص سکول اور کالج جاری کئے جائیں۔

مرکزی حکومت اپنے دفاتر میں اردو اور بنگالی دونوں زبانوں کو سرکاری زبان قرار دیتے ہوئے ان دونوں زبانوں میں کاروبار چلائے۔ اور مرکزی حکومت کے ملازمین ان دونوں زبانوں کو جانتے ہوں۔ مرکزی حکومت کے وہ محکمے جو مشرقی بنگال میں ہیں وہ اُس صوبے سے متعلق سب کام بنگالی میں کریں۔

ریلوے اسٹیشنوں، ڈاک خانوں، تار گھروں، بنکوں وغیرہ پر تمام نوٹس نیز بنک نوٹوں، منی آرڈروں، اور سرکاری کاغذات پر عبارت نہ صرف مرکز کی دونوں زبانوں اردو اور بنگالی میں ہو۔ بلکہ متعلقہ صوبے کی قومی زبان میں بھی ہو۔ اور کوئی کام خواہ کتنا ہی معمولی ہو ایسا نہ کیا جائے جس سے پاکستان میں رہنے والی کسی قوم کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔

کسی زبان کا رسم الخط اُس وقت تک تبدیل نہ کیا جائے جب تک اس قوم کے عوام رضامند نہ ہوں۔

پاکستان میں قومی زبان کے مسئلے کا صحیح حل یہی ہے۔ اس حل سے نہ صرف وہ منافرت دور ہوگی جو برسر اقتدار طبقے نے مختلف صوبوں کے عوام میں ایک دوسرے کے خلاف پیدا کر رکھی ہے۔ بلکہ اُن میں اتحاد، دوستی اور بھائی چارہ کی زنجیریں مستحکم ہو جائیں گی۔

ترقی پسندوں کی کانفرنس کا جائزہ

(از ظ۔ انصاری)

[رسالہ شاہراہ کے شکریہ کے ساتھ ہم اس جائزے کے بعض ضروری ٹکڑے کو نقل کرتے ہیں]

۹ مارچ ۱۹۵۳ء سے دہلی میں آل انڈیا ترقی پسند مصنفین کا چھٹا اجلاس ہونے والا تھا۔ یہ اجلاس جون ۱۹۴۹ء کی بھیمڑی کانفرنس کے بعد ہو رہا تھا اور ایسے حالات میں ہو رہا تھا جبکہ خود انجمن کے مختلف حلقوں میں بڑا خلفشار تھا۔ ایک شاخ کو دوسری کی خبر نہ تھی اور ایک زبان کا کام کرنے والوں کو دوسری زبان والوں سے کوئی ربط نہ تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۹ء میں جو مرکزی ادارہ چنا گیا تھا۔ اس کا جلسہ بھی ان برسوں میں نہیں ہوا تھا۔ کسی شاخ کو یا انجمن کے کسی عام رکن کو دہلی پہنچنے تک یہ نہ معلوم تھا کہ کانفرنس میں کیا کیا مسائل درپیش ہوں گے۔ اور ان کے متعلق خود اس کے صوبے یا شہر کی انجمن کی رائے کیا ہے۔ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے۔ کن سوالوں کو اٹھانا ہے اور کن پر بحث کرنی اور رپورٹ درج ہے۔ سب خالی ہاتھ آئے تھے۔ اور بڑی حد تک خالی الذہن بھی آئے تھے سوائے ایک اہم احساس ضرورت کے۔

اس ضرورت کا احساس سبھوں کو معلوم ہوتا تھا کہ پچھلے تین برس کی حصار بندی کو توڑا جائے۔ بھیمڑی کانفرنس کے مینی فیسٹو کو آخری بار رد کر دیا جائے اور اس کی جگہ انجمن کو زیادہ

سے زیادہ وسیع پیمانے پر منظم کیا جائے۔ اس ضرورت کا احساس زیادہ تر ان ہی زبانوں کے ادیبوں میں تھا جن زبانوں کے ترقی پسندوں میں ۱۹۴۹ء کے بعد سے زیادہ اختلاف رہا ہے اور زیادہ ہنگامہ رہا ہے۔ ایک یہ بھی وجہ تھی کہ دہلی کانفرنس میں زیادہ تر اردو، ہندی، اور پنجابی کے ادیب شریک ہوئے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ کانفرنس کا شمالی ہندوستان میں منعقد ہونا، موجودہ معاشی بحران میں ادیبوں اور مصنفوں کی جو حالت ہے وہ بھی ایک رکاوٹ بنی اور بنگالی، مراٹھی، گجراتی، تامل، تیلگو، ملیالم اور کنڑی زبانوں کے ادیبوں کی نمائندگی نہ ہو سکی کنڑی اور گجراتی زبانوں کے علاوہ باقی ان تمام زبانوں میں ترقی پسند ادب اور ترقی پسند مصنفین کا اچھا خاصا کام ہے اور ان کی بڑی اہمیت ہے لیکن نہ تو ان کی طرف سے کوئی رپورٹ آئی نہ ان کا کوئی مجموعی بیان آیا اور نہ ان کی اتنی تعداد شامل ہوئی جو اپنی زبان کے ترقی پسند مصنفین کی موجودگی کا احساس دلاتی۔

اس سے بھی کانفرنس کی تیاریوں کے پس منظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کانفرنس کی تیاریوں کے سلسلے میں اندرونی خلفشار اور باہمی کشمکش کو بھی بڑا دخل تھا۔ یہ کشمکش ہندی کے ناقدوں سے ہوتی ہوئی انجمن کے عام ممبروں تک پھیل چکی تھی اور کچھ اس قسم کی صورت حال پائی جاتی تھی جسے پوری طرح دھڑے بندی تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر آگے بڑھے تو وہی دھڑے بندی ہو جاتی ہے۔

خود دہلی کی انجمن جو کانفرنس کی تمام تیاریوں کا بار اپنے سر پر اٹھائے ہوئے تھی اس میں یہ باہمی اختلافات اور کشاکش موجود تھی اور اس کی بدولت بعض مقامی ادیب کانفرنس سے اس طرح کنی کاٹ رہے تھے کہ جیسی تیاری ایک آل انڈیا کانفرنس کی ہونی چاہئے، ویسی نہ ہو سکی اور جو مہمان باہر سے دہلی پہنچے انھیں سٹیشن سے اترنے کے بعد پہلا اندازہ یہی ہوتا تھا کہ معاملہ درہم ہے اور چول ٹھیک نہیں بیٹھی ہے۔

ذمہ دار لوگ سوائے رام بلاس شرما اور سردار جعفری کے دیر سے پہنچے اور وہ جس طرح معاملات کو درست کر سکتے تھے، ضروری سامان فراہم کر سکتے تھے، رپورٹیں منگوانے کا انتظام کر سکتے تھے اور کانفرنس شروع ہونے سے پہلے "کچا مال" اکٹھا کر سکتے تھے نہیں کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوائے دو رپورٹوں کے ۱۳ مارچ سے پہلے ایک پرزہ بھی کاغذ کا تیار نہ تھا۔

یہ دو رپورٹیں یا بیان ایک استقبالیہ کمیٹی کے صدر اور انگریزی کے مشہور شاعر ہریندر چٹوپادھیائے کا بیان تھا جو عین وقت کے وقت شائع ہوا اور کانفرنس سے چند گھنٹے پہلے مہمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ (خود ہریندر چٹوپادھیائے اس موقع پر موجود نہ تھے) دوسری رپورٹ انجمن کے جنرل سکریٹری رام بلاس شرما کی تھی جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے بھاگ دوڑ میں تیار کی ہے۔ پھر اس پر بھی اختلاف ہوا اور انتظامیہ کمیٹی کے جو ممبر ۱۳ مارچ کی شام تک پہنچ چکے تھے انھوں نے بحث مباحثے کے بعد اس میں کچھ ترمیم و اضافہ کیا۔ تب جا کے دوسرے روز یہ رپورٹ عین کانفرنس کے وقت ڈیلی گیٹوں میں تقسیم ہوئی۔

پہلا اجلاس

ان حالات میں ۱۳ مارچ کی دوپہر کو دو سو کے قریب باہر کے ڈیلی گیٹ اور اس سے کچھ کم مقامی لوگ کانفرنس کے پنڈال گاندھی گراؤنڈ میں جمع ہوئے۔ کچھ لوگ اس غلط فہمی میں نہیں پہنچے کہ کامریڈ استالین کی وفات پر اجلاس ملتوی ہو گیا ہوگا۔ کچھ لوگوں کو یہ غلط اطلاع ملی کہ پولیس نے دفعہ ۱۴۴ لگا کر کانفرنس کا اجلاس کرنے سے روک دیا ہے۔ چنانچہ وہ بھی شریک نہ ہوئے۔

اکثر ڈیلی گیٹوں نے کانفرنس کے پنڈال میں داخل ہوتے وقت اپنی ادبی روایت کو برقرار رکھا اور وقت مقررہ پر پنڈال میں داخل ہونے کے بجائے باہر گھومتے رہے۔ یعنی

آگے چلیں گے دم لیکر۔

اتنے میں کانفرنس کے ذمہ دار لوگوں نے طے کیا کہ کامریڈ استالین کی وفات پر یہ اجلاس کچھ دیر کے لئے یا پورے دن کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ انھوں نے اس کا آخری فیصلہ حاضرین پر چھوڑ دیا اور بغیر کسی حیل حجت یا اختلاف کے سب نے چاہا کہ کانفرنس کا یہ اجلاس تعزیت کی ایک تجویز منظور کر کے برخاست ہو جائے۔ چنانچہ دو منٹ کی خاموشی کے بعد اجلاس شام تک

کے لئے ملتوی ہو گیا۔

پہلے اجلاس کی ساری کارروائی دوسرے جلاس میں ہوئی جو اسی روز شام کو پنڈال میں منعقد ہوا۔ اسی وقت تمام حاضرین کو جنرل سکریٹری یا انتظامیہ کمیٹی کی رپورٹ (اس پر لکھا ہوا تھا کہ کس کی طرف سے جاری کی گئی ہے) آخری بار تقسیم کر دی گئی۔ اس اجلاس میں حاضری بھی زیادہ تھی اور اب جا کر کانفرنس کا سا ماحول پیدا ہونے لگا تھا۔

اس میں اردو کے ادیب سب سے زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ کلکتہ، پٹنہ، رانچی، لکھنؤ، گورکھپور، الہ آباد، علی گڑھ، دہلی، جالندھر، بمبئی، سی پی، مدھیہ بھارت سے اچھی خاصی تعداد میں ڈیلی گیٹ پہنچ چکے تھے۔ چونکہ ان کے ٹھہرنے کا کسی ایک جگہ یا ایک سلسلے اور سسٹم کے ساتھ انتظام نہیں تھا اس لئے اب تک ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔ اب اس اجلاس میں کھلا کہ اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ اس کے بعد تعداد کے لحاظ سے ہندی کے ادیب تھے ہندی کے ادیبوں میں زیادہ تر یوپی اور بہار کے لوگ تھے اور جن ادیبوں کے خاص طور سے شریک ہونے کی امید تھی ان کی بڑی تعداد موجود نہ تھی۔ ان کے بعد پنجابی کے ادیب اور شاعر نمایاں تھے۔ بنگالی زبان کے ادیب جنھیں بڑی تعداد میں نمایاں ہونا تھا بہت کم تھے اور اگر گوپال ہلدر نہ ہوتے تو شاید مجلس صدارت میں کسی بنگالی ادیب کو شریک کرنے کے بھی ٹوٹے تھے تامل، تیلگو اور گجراتی کی نمائندگی کرنے کے لئے کوئی قابل ذکر ادیب موجود نہ تھا۔

ڈاکٹر رام بلاس شرما کی تجویز پر گوپال ہلدر (بنگلہ)، پروفیسر موہن سنگھ (پنجابی)، رگھوپتی سہائے فراق، آل احمد سرور (اردو) شاعر نرالا ناگ ارجن (ہندی) دامودرن (کنڑی) اور ڈاکٹر ملک راج آنند (انگریزی) مجلس صدارت (پریسیڈیم) میں چنے گئے۔ ان میں ڈاکٹر آنند اور نرالا موجود نہ تھے۔

ہریندر چٹوپادھیائے کا استقبالیہ خطبہ سلامت اللہ صاحب (جامعہ ملیہ) نے پڑھ کر سنایا۔

گرچونکہ خود اس کے مصنف موجود نہ تھے اس لئے حاضرین نے کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ اس کے بعد بین الاقوامی شہرت کے کئی ادیبوں کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔ ننلنے اور ہوورڈ فاسٹ کے پیغام پر خاص طور سے مسرت کی لہر دوڑی۔

اس روز خصوصیت سے مجلس صدارت کی تقریروں میں سارا وقت ختم ہو گیا۔

پہلی تقریر گوپال ہلدر کی ہوئی جو انگریزی زبان میں تھی۔ گوپال ہلدر تحریک کے جتنے آزمودہ کار لیڈر ہیں اور جتنی اُن کی خدمات کی فہرست طویل ہے اتنی ہی اُن کی تقریر بھی تھی جس میں تمام دہرائی ہوئی باتیں کہی گئی تھیں۔ لیکن وہ اس لئے توجہ سے سنی گئی کہ اس کی حیثیت کانفرنس کے آغاز کی سی تھی۔ ادبی مسائل سے تعارف کی سی تھی اور مقرر کا لہجہ مشفقانہ اور بزرگانہ تھا۔

گوپال ہلدر نے موجودہ سماج میں ترقی پسند ادیبوں کے فرائض گنائے اور کہا کہ ترقی پسند ادب دراصل وہ ادب ہے جو ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دے۔ آج اس کی آزمائش عالمی امن اور جنگ کے مسائل ہیں جب ادیب اپنے ادب کو انسانیت کی بہبود کی خاطر امن کی حمایت کے لئے استعمال کرتا ہے۔

پروفیسر سرور

اس کے بعد پروفیسر سرور (لکھنؤ یونیورسٹی) کی تقریر ہوئی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اردو زبان کی اہمیت کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ ایک پھلتی پھولتی مکمل زبان ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے زیادہ تر قومی کلچر اور ادب کے رشتے کو تقریر کا موضوع بنایا اور کہا کہ ادب کا مقصد عوام کی خدمت ہے اور قومی تہذیب کو بہتر بنانا، اسے فروغ دینا اور مالا مال کرنا ہے۔ جس کی زیادہ تر ذمہ داری ترقی پسندوں پر آتی ہے۔

ڈاکٹر عبد العلیم

اس کے بعد ڈاکٹر عبد العلیم (علی گڑھ یونیورسٹی) نے ایک متوازن مگر مفصل تقریر کی۔

ڈاکٹر علیم کی تقریر کا موضوع بھی تقریباً وہی تھا۔ امن اور جنگ کی کشمکش میں ترقی پسند ادب کا فرض اور تہذیب کے بنانے میں ادب کا حصہ۔ انھوں نے فرمایا۔

"آج کی ابتری اور بحران کے دور میں انسان کی بہترین قدریں خطرے میں ہیں۔ تہذیب کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ انتہائی گندی، پست، فحش اور دہشت انگیزی کی تحریریں پھیلا کر اور لوگوں کے ذہن کو جنگی جراثیم سے زہر آلود کر کے تہذیب کے غلط معنی لئے اور پھیلائے جا رہے ہیں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ اس زہر کے لئے تریاق لائیں اور صحت مند اور۔۔۔۔ [illegible] طریقوں سے اپنے ادب کی بہتر قدروں اور طاقتوں کے ذریعہ سے اس مہم کا مقابلہ کریں۔ ہماری ترقی پسند ادب کی تحریک خود قومی تہذیب کی جڑ سے پھوٹی ہے، وہ کوئی بیرونی چیز نہیں اور نہ اجنبی شے ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ قومی تہذیب کے بہترین ورثے کو آگے بڑھائیں اور ہر زبان کو وسعت اور ترقی کے سارے موقعے فراہم ہوں۔۔۔۔۔"

ان کے بعد پروفیسر موہن سنگھ کی تقریر ہوئی۔ پروفیسر صاحب پنجابی کے بڑے اچھے شاعر ہیں لیکن ان کی تقریر زیادہ تر ان تنقیدی کتابوں کا ایک ورق تھی جو بارہویں کلاس کے طالب علموں کو پڑھائی جاتی ہیں۔

ناگ ارجن اور باقی حضرات نے وقت نہیں لیا۔ صدارتی تقریروں میں سب کا ڈھرا ایک سا تھا۔ اس لئے ان کی طرف سے حاضرین کی بے توجہی بھی یکساں رہی اور پھر ان تقاریر کی حیثیت محض رسمی تھی۔ ان میں یہ کوشش نہیں تھی کہ حاضرین کے ذہن کو زیر بحث آنے والے کسی مسئلہ پر تیار یا متوجہ کیا جائے اور نہ یہ کہ مقررین ان زبانوں کے ترقی پسند ادب کی پچھلی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے جن کی وہ نمائندگی کر رہے تھے اور دوسری زبانوں کے ادیبوں اور ڈیلی گیٹوں کو ان سرگرمیوں سے اور درپیش سوالوں سے آگاہ کرتے۔

ان تقریروں اور پیغامات کے سنائے جانے کے بعد کانفرنس کا پہلا اجلاس اگلے دن کے لئے ملتوی ہو گیا۔

دوسرا اجلاس اور بحث

دوسرے روز کا کانفرنس کا اجلاس گھنٹہ بھر دیر سے شروع ہوا۔ آج وہ رپورٹ پڑھ کر سنائی گئی جس میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے پچھلے سترہ سال کا ذکر تھا۔ تحریک پر مختلف اعتراضات کا جواب تھا اور آئندہ کے پروگرام کے لئے کچھ تجویزیں تھیں۔

اصل رپورٹ سنا دینے کے بعد اس کا ہندوستانی ترجمہ بھی خود ڈاکٹر رام بلاس شرما نے کیا۔

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہوگا کہ اجلاس سے کچھ پہلے اسی پنڈال میں غیر رسمی سا ایک کھلا جلسہ ہو چکا تھا جس کا منشا یہ تھا کہ اصل اجلاس سے پہلے باہمی مشورے اور بحث سے یہ طے کر لیا جائے کہ کون کون سوال کانفرنس میں اٹھائے جائیں اور کن کو درگزر کیا جائے۔ اس جلسہ کی صدارت فراق گورکھپوری کر رہے تھے اور اس میں اردو، ہندی اور پنجابی کے تقریباً ۲۵۔۳۰ ادیب شامل تھے۔ کسی کو معلوم نہ تھا یہ کس کی طرف سے ہے اور کس کو ذمہ دار بنایا جائے تاہم اس غیر رسمی جلسے میں سکریٹری یا انتظامیہ کمیٹی کی رپورٹ پر مختلف نکتے اور مختلف اعتراضات اٹھائے گئے مگر چونکہ درمیان میں ہی اردو ہندی زبانوں کا سوال خود بخود پیش آ گیا اور چونکہ اس سوال پر خود اردو ہندی کے حاضرین ادب متفق نہ تھے اس لئے بحث اپنی حدود سے آگے بڑھنے لگی اور یہ جلسہ صرف ایک فیصلہ کر کے منتشر ہو گیا۔ فیصلہ یہ تھا کہ ۴ مقررین چنے جائیں جو رپورٹ کی ۴ خامیوں پر الگ الگ توجہ دلائیں گے۔ ایک ڈاکٹر محمد حسن دوسرے ظ۔ انصاری تیسرے راجندر سنگھ بیدی۔ چوتھے الہ آباد کے ایک ہندی ادیب۔

چنانچہ کانفرنس کا اصل اجلاس شروع ہونے کے بعد جب جنرل سکریٹری اپنی رپورٹ کا ترجمہ سنا چکے اور حاضرین کو دعوت دی گئی کہ وہ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ تو سب سے پہلے ڈاکٹر محمد حسن بولے۔ ان کی تقریر کا اصل نکتہ یہ تھا کہ رپورٹ میں سب سے بڑی خامی اس کی چشم پوشی ہے اپنے پر تنقید کرنے سے۔ پچھلے ۴ برس میں جو خامیاں ہوئی ہیں اور جو جو غلطیاں انجمن یا اس کے ذمہ دار لوگوں سے تحریک کے

یہ رُخ پر لیجانے میں، ادب کو آگے بڑھانے اور بہترین بنانے میں پیش آئی ہیں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ اس خود انتقادی کے بغیر رپورٹ کسی طرح مکمل نہیں ہوتی۔ ۱۷ برس کی تحریک کا جائزہ لیا جائے اور اس میں تحریک کا پورا جائزہ بھی نہ ہو یہ ایک بڑی کمزوری ہے اور اس لحاظ سے رپورٹ ناقص ہے۔

انھوں نے کہا کہ ترقی پسند تحریک کی ادبی حیثیت کو فراموش کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم خام سیاسی رنگ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں اور بالآخر موزوں اشعار، بے رنگ اور سپاٹ افسانے اور غیر ادبی تنقیدیں صرف اس لئے سر آنکھوں پر لے لی گئیں کہ ان میں ہنگامی سیاسی نعرے موجود تھے۔ ادب میں سیاسی مسائل کی اہمیت ضروری ہے لیکن ادبی روپ اور حسن کے ساتھ۔

انھوں نے انجمن کی تنظیمی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کھلے اجلاس سے مطالبہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو اب پھر سے ذمہ داریاں سپرد نہ کرے جن پر پچھلے چند برسوں میں غلطیاں کرنے اور انجمن کی طرف سے لاپرواہی برتنے کا الزام ہو۔

ڈاکٹر محمد حسن کی تقریر معلوم ہوتا تھا کہ گھرے ہوئے بادل سے بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ اس کے فوراً بعد بنگال کے نمائندے سری نارائن جھا نے تقریر کی ان کا لب و لہجہ بہت ترش تھا اور انھوں نے انجمن اور تحریک کے علاوہ ذاتیات کا بھی ذکر کیا جس سے ان کی رائے میں، انجمن کے وقار کو اور ادبی کام کرنے والوں کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچا۔

سری نارائن جھا کی تقریر کے بعد فراق گورکھپوری اٹھے اور انھوں نے رپورٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بحث اٹھائی جس کے لئے جداگانہ اجلاس ضروری تھا۔ یہ بحث ادب کے صورت و معنی (Form & Content) پر تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہم روز بروز ادبی حسن سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور کھردرے پن کو بھی اچھے ادب میں اس لئے شمار کرنے لگے ہیں کہ اس کے معنی اچھے ہیں اور اس کا موضوع سیاسی یا سماجی ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ "بھلا یہ بھی کوئی تعریف کی بات ہے کہ کسی کے ادب کے بارے میں کہا جائے کہ ہاں صاحب بات تو اچھی کہی مگر بھدے طریقے سے کہی گئی" ایسی "اچھی بات" کا اثر کیا خاک ہوگا اور جس میں اثر نہیں اُسے آپ ادب کیونکر شمار کریں گے؟

انھوں نے کہا کہ ہمیں ادب کے روپ اور اس کی ہیئت و صورت پر بھی پورا دھیان رکھنا چاہئیے، اگر ہمارا ادب اپنے ظاہری حُسن و کشش میں رجعت پرستوں کے ادب سے پست یا کمتر رہ جاتا ہے تو آپ یقین کیجئے کہ مواد و معنی کے لحاظ سے چاہے اس میں کتنی ہی انقلابی باتیں کیوں نہ ہوں وہ ادنیٰ درجے کا ادب ہے۔

ہمارا ادب بدلنا چاہئیے اور ہمارا مقصد یہ ہونا چاہئیے کہ ہم صرف اپنے موضوعات اور معنی کے میدان میں ہی نہیں بلکہ حُسن صورت میں بھی رجعت پرست ادیبوں کو شکست دے سکیں۔ تبھی جا کر ہمارا ترقی پسند ادب حاوی ہو سکتا ہے۔

ظ۔ انصاری

ان کے بعد ظ۔ انصاری کا نمبر آیا۔ ظ۔ انصاری نے رپورٹ کے مختلف حصے پڑھ کر سنائے اور کہا کہ تحریک اور تنظیم کے فرق کو مد نظر رکھ کر دیکھا جائے تو یہ

رپورٹ کافی ناقص ہے۔ تحریک ایک عام رجحان اور اثر پھیلنے اور پھیلانے کا نام ہے۔ تنظیم اس عام رجحان یا اثر کو ایک قوت کی شکل کو ڈھال لینے اور سمیٹ لینے کا نام ہے۔ رپورٹ میں ترقی پسند مصنفین کی جن کامیابیوں کا ذکر ہے وہ ہماری تنظیم کا نہیں بلکہ تحریک کا نتیجہ ہیں اور اس فرق کو دیکھنا ہو تو مثال کے طور پر ایک طرف تو یہ دیکھئے کہ ہمارے سب سے بڑے غزل گو شاعر جگر مرادآبادی یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں اور ان کے رجحان میں ترقی پسند عناصر تیزی سے بڑھ رہے ہیں کیا اس میں ہماری تنظیم کا کچھ حصہ ہے؟ نہیں بلکہ یہ تحریک کا حاصل ہے۔ تنظیم کا حاصل یا اُس کی لاحاصلی یہ ہے کہ سماج کے سب سے پچھڑے ہوئے طبقہ کسانوں تک کی آل انڈیا کانفرنس جن تیاریوں کے ساتھ ہوتی ہے ہم پڑھے لکھے طبقہ کے باشعور لوگوں کی کانفرنس ان تیاریوں سے بھی محروم ہے۔ نہ کسی زبان کی کوئی مکمل رپورٹ موجود ہے۔ نہ زبانوں کے مسئلے پر بحث کے لئے مسودہ ہے۔ نہ اس سلسلے میں کوئی ہمارا متفق نظریہ ہے اور نہ کسی کو یہاں اس وقت تک یہ معلوم ہے کہ کانفرنس میں کیا کیا مسائل زیر بحث آنے والے ہیں اور ان پر اُسے نمائندے کی حیثیت سے کیا رائے دینی ہوگی۔

ظ۔ انصاری نے رپورٹ کے چند جملے پڑھ کر سنائے جن میں مشورہ تھا کہ ادیبوں کی اس انجمن کو فلاں فلاں کمزوریوں مثلاً "باہمی بڑھاوے چڑھاوے اور من ترا حاجی بگویم کی گروہ بندی" سے پاک ہونا چاہیئے۔ اس کا حوالہ دے کر مقرر نے سوال کیا کہ اسی رپورٹ میں چند بڑے ادیبوں کے نام گنوائے گئے ہیں مگر ان میں کئی ان سے بھی بڑے یا برابر کے ادیبوں کا نام غائب ہیں جو خود اپنے مشورہ کی خلاف ورزی ہے۔ میرا مشورہ ہے ان جملوں کو رپورٹ سے خارج کر دیا جائے۔

ظ۔ انصاری نے مزید زور دیا کہ رپورٹ کی اس تجویز کو نہ ماننا چاہیئے کہ ضرورت ہو تو ہر زبان اپنا الگ مینی فسٹو بنائے اگر اس کانفرنس کو ایک متحدہ محاذ اور زیادہ وسیع بنیاد کی داغ بیل ڈالنی ہے تو سب زبانوں کے ترقی پسندوں کا ایک مشترک مینی فسٹو ہونا چاہیئے جس سے بنیادی مسائل پر سب کا اتفاق ہو تبھی یہ کانفرنس ایک وسیع اتحاد کی بنیاد ڈال سکتی ہے۔

اس کے بعد ہری دت شرما نے تقریر کی۔ انھوں نے اپنے پچھلے مقررین کے چند نکتوں سے اتفاق کرتے ہوئے خاص طور سے کہا کہ انجمن کے پچھلے کاموں کی تنقید کے سلسلے میں کانفرنس کی عام فضا بہت سخت ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں اس میں اعتدال سے کام لینا چاہیئے۔

اس کے بعد چند نوجوان ادیبوں نے اور شدت سے کام لیا۔ کئی ڈیلی گیٹوں نے خاص طور سے ایک راجستھانی اور ایک بہاری ادیب نے اس نکتے پر زور دیا کہ انجمن کو کمیونسٹ پارٹی کا ایک بازو بن کر کام نہ کرنا چاہیئے بلکہ اُسے صرف ادبی محاذ ہونا چاہیئے۔ اب تک چونکہ سیاست کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور ترقی پسند مصنفین کی پالیسی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی کے ماتحت رہی ہے اس سے ادب کو نقصان پہنچا ہے۔

یہاں پہنچ کر جذبات اور گرم ہو گئے بعد میں دو مقرروں نے سوال کیا کہ اگر ترقی پسند مصنفین میں بعض اچھے ادیب کمیونسٹ ہوں یا اگر کمیونسٹ ادیبوں کا اثر و اقتدار ان کی خدمات کی وجہ سے بڑھ جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انجمن کمیونسٹوں کا ایک بازو ہے؟ یا ان کی مٹھی میں ہے؟ (باقی آئندہ)

باہتمام عزیز حسین نیشنل پریس کمپنی میں چھپا اور قاضی عبدالغفار صاحب پبلشرز نے صدر دفتر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا۔